منیر رپورٹ سے منیر رپورٹ تک

جناب نعیم صدیقی صاحب

(۳)

جسٹس منیر صاحب کی کتاب میں جس طرح صفحہ بہ صفحہ ایک ایک فقرے میں [illegible] چھوڑے گئے ہیں۔ ان کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوا کہ اگر ہر شگوفے پر بات [illegible] تو ایک تو سلسلہ طویل ہوگا، دوسرے تمام گفتگو "متفرق" طرز کی ہو جائے گی۔ بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ متفرقات کو چھوڑ کر اہم اصولی بحثوں کو لیا جائے۔

ہمارے محترم جسٹس منیر نے اسلام کے حق میں جو جو بھی کرم فرماتے ہیں۔ اُن کی اصل بنیاد اس پر ہے کہ وہ اسلام کا غیر سیاسی تصور اختیار کرتے ہیں اور سے سیکولر ریاست کے فریم میں فٹ کر کے دیکھتے ہیں۔ جدید مغربی دورِ تمدن کے تاسیس کرنے والے فلسفیوں اور سیاست کاروں کا یہ کمال ہے کہ اُن کے خطوط کے مطابق مسلمانوں پر ظلم و جبر سے جو خالص دُنیوی اور لادین حکومتیں مسلط کی گئیں، انہوں نے اپنے نظامِ تعلیم، اپنے معیارِ عز و شرف، اپنے قوانین اور اپنے پروپیگنڈے کے زور سے اسلام کو پوری زندگی کا دین سمجھنے والے مسلمانوں کے ذہن کو جس طرح مسخ کیا، اس کی بہترین معیاری مثالوں میں سے ایک جسٹس منیر ہیں وہ نہ صرف سیکولر تصور کے قائل ہیں بلکہ اس کے پُرزور دلائل دیتے ہیں اور علماء کے علاوہ اسلام کے بالمقابل کھڑے ہو کر اپنا دعویٰ دھڑلے سے پیش کرتے ہیں۔ یہ ان چند خاصانِ مغربیت میں سے ہیں جو اسلام کو مغربی طرزِ فکر کے سانچے میں ڈھال کر اس کی من مانی شکل بناتے ہیں، مگر یہ جرأت نہیں کر سکتے کہ اسلام کے معیار پر دوسروں کے مسلط کردہ

افکار کو پرکھیں۔

اصل قضیہ یہ ہے کہ سرے سے وہ نظریہ مذہب (THEORY OF RELIGION) کو نہیں جانتے کہ آخر مذہب کس کی طرف سے ہے، کیوں ہے، وہ کن وجوہ سے قابلِ اعتماد ہے اور انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں اس کے برسرِ عمل ہونے سے کیا کیا مفید اور اعلیٰ نتائج انسانیت کو ملتے ہیں۔

مذہب سے پہلے نظریۂ مذہب کو بڑی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ اگر ایک صحیح نظریۂ مذہب ہاتھ آجائے تو پھر دنیا بھر کے مروج مذاہب کو بآسانی اس پر جانچا جا سکتا ہے۔

ہمارا نظریۂ مذہب (یا اگر نظریہ کا لفظ باعثِ الجھن ہو تو ہماری حکمتِ مذہب) یہ ہے کہ:-

۱۔ یہ کائنات ایک خدا کی تخلیق کردہ ہے اور اس میں جتنی بھی مخلوق پائی جاتی ہے وہ سب کی سب اسی کے اقتدار اور قانون کی پابند ہے، اور اسی وجہ سے اس میں انتہائی کڑا نظم ہے، جس میں بڑے سے بڑے اجرام اور ننھے سے ننھے ذرّے سبھی جکڑے ہوئے ہیں، اور اسی لیے کائنات تخریب کے بجائے تعمیر و ارتقاء کی طرف بڑھ رہی ہے۔

پس انسان بھی خدا کی مخلوق ہے اور اس کے لیے بھی جس طرح جسم اور نفسیات کے قوانین ہیں، اسی طرح انسانی زندگی کے لیے ایمانی، اخلاقی اور معاشرتی و تمدنی قوانین بھی خدا کی طرف سے مقرر ہیں۔ ان مقرر شدہ قوانین کی پابندی میں نظم اور ارتقاء ممکن ہے، ورنہ فساد اور تصادم اور تباہی کا خطرہ ہے۔

۲۔ جس پوری کائنات کا مسلک خدا کی اطاعت (اسلام) ہو اس کی بے شمار مخلوق اور موجودات کے درمیان اگر ایک مخلوق زندگی کے کسی حصے میں اطاعت و اسلام کے سوا کوئی دوسرا راستہ اختیار کرلے تو اسے کائنات میں ایک انمل بے جوڑ پوزیشن حاصل ہوگی۔

۳۔ انسانی زندگی میں سیکولرسٹوں کے تصورِ مذہب کے مطابق اگر ذاتی اور نجی اور گھریلو معاملات میں خدا کی طرف سے مذہبی رہنمائی کی ضرورت ہے تو پھر اُن کے مقابلے میں بڑے بڑے سیاسی و معاشی اور بین الاقوامی معاملات میں یہ ضرورت کیوں نہیں ہے۔ اگر ان دائروں میں عقل اپنا راستہ آپ تلاش کرنے پر قادر ہے تو وہ ذاتی اور نجی اور گھریلو زندگی میں کیوں نہیں؟

۴ - زندگی کے کسی ایک چھوٹے سے دائرے کے لیے خدا کو ماننا اور اُس کے مذہب کو قبول کرنا، اور دوسرے بڑے بڑے دائروں میں خدا کی خدائی کو چھوڑ کر اپنی خدائی جما لینا اور اس کے مذہب سے بے نیاز ہو کر اپنا مذہب خود گھڑنا یہ تو شرک کی بدترین صورت ہے۔

اگر کوئی خدا نہیں ہے تو پوری زندگی کو آزاد ہونا چاہیے، اور خدا ہے تو اُس کی خدائی کا سکّہ زندگی کی سلطنت کے کسی ایک صوبے یا ضلعے میں کیوں چل کر رہ جائے، وہی ایک سکّہ ساری زندگی میں چلنا چاہیے۔

۵ - ہماری حکمتِ مذہب یہ ہے کہ خدا کی مرضیات اور اُس کے قوانین کو اس کے مقرر کردہ رسول پہنچانے آتے ہیں، جو خدائی تعلیم کے تسلسل اور اس کے معیار اور اُس کے انداز نیز اپنے غیر معمولی کردار اور شروع سے آخر تک اپنے بے لوث رویے بلکہ اپنی دی ہوئی قربانیوں کی روشنی میں پہچانے جاتے ہیں۔

خدا کے یہ رسول خدا کے مقرر کردہ نمائندے ہوتے ہیں اور جہاں یہ خدا کی کتاب (ہدایت و حکمت مع قانون) لاتے ہیں، وہاں یہ اس پر ذاتی طور پر بھی عمل کر کے، اس کے تقاضوں کے مطابق ایک معاشرہ تیار کر کے اور ایک ریاست کی تشکیل کر کے دکھا دیتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی تعلیم اور اُس کا قانون انسان سے کیسی انفرادی، کیسی سوشل، اور کیسی سیاسی و ریاستی زندگی چاہتا ہے۔

کسی کا یہ منصب نہیں کہ وہ خدا کے رسولوں کی پیش کردہ ہدایت، حکمت، قانون اور نمونہ کار کے ٹکڑے کر کے یہ کہے کہ اس میں فلاں فلاں ٹکڑے تو مجھے قبول ہیں، فلاں قبول نہیں۔ دوسری چیزیں میں کسی اور مذہب سے، کسی اور گروہ فلاسفہ سے، کسی اور تحریک سے قبول کر لوں گا۔

بس یہ ہے پتے کی بات! جو ذہن اس میخ کو اپنے اندر گاڑ لے، پھر نہ وہ مسلمان کی تعریف جان سکتا ہے، نہ کافر کے معنی اس کی سمجھ میں آ سکتے ہیں، نہ وہ اسلامی ریاست کا تصور اخذ کر سکتا ہے، اور نہ یہ راز اس پر کھل سکتا ہے کہ اسلامی ریاست کا نظریاتی ریاست ہونا چہ معنی دارد؟

ہمارا نظریہ مذہب یہ ہے کہ ایک خدا ہے، اس کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے تمام انسان برابر کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان سب کو ایک ہونا چاہیے۔ اور ان انسانوں کو خدا کا مقرر کردہ ایک ہی نظام اختیار کرنا چاہیے۔ قرآن کی واضح تعلیمات وحدتِ اِلٰہ، وحدتِ آدم اور وحدتِ دین

کے تین نکات دینی ہے جن سے توحید کا بنیادی تصور قائم ہوتا ہے۔

ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جسٹس منیر کا بنیادی تصورِ مذہب کیا ہے؟

سیکولر تصورِ مذہب اور اسلامی تصورِ مذہب کے فرق کی وجہ سے دونوں طرف ریاست کے تصورات الگ الگ ہو جاتے ہیں۔

مغرب کو عیسائیت سے سابقہ پڑا جس کے پاس نہ تو تاریخی شہادتوں کی بنیاد پر ثابت شدہ خدا کی کتاب غیر محرف حالت میں موجود تھی، نہ وہ پورا ضابطۂ حیات اس سے اخذ کر سکتے تھے، لہٰذا انہوں نے تھیوکریسی اور پاپائیت کا راستہ اختیار کیا اور خدا کے قانون کے خلا کو پادریوں کے طبقے نے اوّل روز سے بھرتے رہنے کی کوشش کی۔ اس طرح خدا کے مذہب کے تھوڑے سے جزو کے ساتھ پادریوں کا گھڑا ہوا بہت بڑا حصہ مذہب بھی اختیار کر لیا گیا۔ ایسے مذہب کے تحت جب تھیوکریسی قائم ہوئی تو وہ وبال بن گئی اور اس کے خلاف (اسلامی اثرات کے تحت) ریفارمیشن کی تحریک اٹھی جس نے بعد از خرابیٔ بسیار کلیسا اور ریاست کو الگ کر دیا۔ یوں وہ نیا سیکولر تصورِ ریاست بنا اور اسی طرح غلط ہو کر رہ گیا جس طرح اس سے پہلے تھیوکریسی غلط تھی۔

یہاں پہنچنے کے بعد اسلامی ریاست کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا ہے؟

سب سے پہلے تو میں منیر صاحب کو ایک جگہ سے نکالنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ نظریاتی (اسلامی) ریاست کے تصور پر آ پڑتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ پہلی بار یہ اصطلاح انہوں نے قادیانی تحقیقاتی عدالت میں سنی تھی، یا جنرل محمد ایوب کی کابینہ میں۔

میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جہاں تک اس اصطلاح کا تعلق ہے، تحریکِ اسلامی کی بالکل ابتداء (۱۹۴۱ء) سے ہر شخص دین کے وسیع تصور میں ریاست کو مضمر سمجھتا رہا ہے اور بارہا تقریروں اور لٹریچر میں نظریاتی یا اعتقادی ریاست کا حوالہ آیا ہے۔ یہاں میرے سامنے ایک مقام ہے جہاں —— غیر مسلموں کے حقوق نامی پمفلٹ کی ابتداء ہی میں یہ جملہ درج ہے کہ "اسلام کی حکومت دراصل ایک اصولی (IDIOLOGICAL) حکومت ہے۔" یہ مضمون ماہنامہ ترجمان القرآن بابت اگست ۱۹۴۸ء میں چھپا ہے[1]۔

---

[1] ملاحظہ ہو، اسلامی ریاست از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور، ص ۵۷۵

ایک اور ضروری حوالہ:

"..... ہم دیکھتے ہیں کہ وہ (قرآن) لفظِ دین کو ایک جامع اصطلاح کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے اور اس سے مراد ایک ایسا نظامِ زندگی لیتا ہے جس میں انسان کسی کا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کر کے اس کی اطاعت و فرمانبرداری قبول کرے، اس کے حدود و ضوابط اور قوانین کے تحت زندگی بسر کرے، اس کی فرمانبرداری پر عزت، ترقی اور انعام کا امیدوار ہو اور اس کی نافرمانی پر ذلت و خواری اور سزا سے ڈرے۔ غالباً دُنیا کی کسی زبان میں کوئی اصطلاح ایسی جامع نہیں ہے جو اس پورے مفہوم پر حاوی ہو، موجودہ زمانہ کا لفظ "اسٹیٹ" کسی حد تک اس کے قریب پہنچ گیا ہے۔ لیکن ابھی اس کو دین کے پورے معنوی حدود پر حاوی ہونے کے لیے مزید وسعت درکار ہے"[1]

پھر سورۂ مومن کی آیت ۳ پر کلام کرتے ہوئے مولینا فرماتے ہیں: ۔

" قرآن میں قصۂ فرعون و موسیٰؑ کی جتنی تفصیلات آتی ہیں ان کو نظر میں رکھنے کے بعد اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہاں دین مجرد "مذہب" کے معنوں میں نہیں آیا ہے، بلکہ ریاست اور نظامِ تمدن کے معنی میں آیا ہے۔ فرعون کا کہنا یہ تھا کہ اگر موسیٰؑ اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے تو اسٹیٹ بدل جائے گا۔"[2]

مولانا نے مغربی تھیوکریسی اور ریاست اور کلیسا کی تفریق اور سیکولرازم پر بحثیں کی ہیں تاکہ وہاں کے نظریۂ ریاست کا پس منظر واضح ہو جائے۔ لیکن علامہ اقبال مرحوم نے بھی اس موضوع پر کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پنڈت جواہر لعل نہرو والی خط و کتابت میں انہوں نے ان مباحث کو جس خوبی اور صراحت سے لیا ہے وہ اس وقت کے ہم جیسے نوجوانوں کے دل و دماغ کو تہ و بالا کر دینے والے تھے۔ فلسفۂ مغرب کی تمام مرعوبیتیں اس شخص کے خیالات سامنے آنے پر ہوا ہو گئیں، اور بہ حیثیت مسلمان اپنے اوپر نوجوان طبقوں کا اعتماد پہلی بار بحال ہونے لگا۔ علامہ اقبال نے اپنی تحریروں میں تجزیہ کر کے

---

[1] ملاحظہ ہو قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں۔ از مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور ص ۹۳/۹۲

[2] ایضاً ص ۹۲

بتایا کہ اسلام مغربی اداروں سے ہٹ کر ایک جداگانہ قسم کی ہیئت اجتماعیہ یا ہیئت سیاسیہ ہے۔ وہ مسلمانوں کی ہیئت سیاسیہ سے مذہب کو کاٹ کر الگ نہیں لے جاتے جو ایک جان کی طرح اس کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوئے ہے۔

ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر میں لکھتے ہیں:۔

"ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی، اس لیے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے ...... اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت (یا ہیئت اجتماعیہ۔ دنے حوے) کا دارومدار ایک خاص تہذیبی تصور پر ہے"[1]

مزید توضیح ملاحظہ ہو:۔

"کسی فرانسیسی کے مذہب پر نکتہ چینی کیجیے وہ بہت ہی کم متاثر ہوگا، اس لیے کہ آپ کی نکتہ چینی نے اس اصول کو مس نہیں کیا، جو اس کی قومیت کی روح رواں ہے۔ لیکن ذرا اس کے تمدن، اس کے ملک یا پولیٹیکل سرگرمی کے کسی شعبے کے متعلق اس کی قوم کے مجموعی طرز عمل یا شعار پر تو خردہ گیری کرکے دیکھیے، پھر اس کی جبلی عصبیت کا شعلہ نہ بھڑک اٹھے تو ہم جانیں۔ بات یہ ہے کہ فرانسیسی کی قومیت کا اظہار اس کے معتقدات مذہبی پر نہیں بلکہ جغرافیائی حدود یعنی ملک پر ہے۔

ہماری حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت ایک شے محسوس فی الذہن ہے، موجود فی الخارج نہیں۔ بلحاظ ایک قوم ہونے کے ہم جس مرکز پر آکر جمع ہو سکتے ہیں۔ وہ مظاہر آفرینش کے متعلق ایک خاص قسم کا اشراقی سمجھوتہ ہے جو ہم نے آپس میں کر رکھا ہے۔

پس اگر کسی کا ہمارے مذہب کو برا کہنا، ہماری آتش عصبیت کو برافروختہ کرتا ہے۔ میری دانست میں یہ برافروختگی اس فرانسیسی کے غصہ سے کچھ کم واجبی نہیں جو

---

[1] مقالات اقبال - از محمد رفیق افضل - ص ۱۲۰

اپنے وطن کی برائیاں سن کر بھڑک اٹھتا ہے[1]۔

پھر وہ کہتے ہیں :-

"مذہبی خیال ......" اسلامی جماعت کی ہیئت ترکیبی کا مدار علیہ ہے"[2]۔

چند الفاظ اور......

"مذہب کو فلسفۂ نظری بنانے کے لیے کوشش کرنا میری رائے میں بے سود محض ہے، ...... بلکہ اس کی اصلی غایت یہ ہے کہ زندگی کی سطح کو بتدریج بلند کرنے کے لیے ایک مربوط اور متناسب عمرانی نظام قائم کیا جائے۔ مذہب سیرت انسانی کا ایک نیا اسلوب یا نمونہ پیدا کر کے...... ایک نئی دنیا کو نیست سے ہست کرنا ہے"[3]۔

اور آخر میں کیا خوب کہا :-

"اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں"[4]

اصل بنیادی بات تو سمجھنے کی یہی ہے کہ اسلام بطور کلمہ جامعہ، اسلام بطور نقیب دعوت، اسلام بطور ہیئت اجتماعیہ، اسلام بطور سیاسی اسٹیٹ، اسلام بطور تحریک انقلاب اور تحریک جہاد ہم پر واضح ہو جائے۔ پھر مسلمان کی تعریف بھی مشکل نہیں، پھر اسے چلانے والوں کے اوصاف بھی متعین ہو سکتے ہیں، پھر اس کا معاملہ مرتدین سے بھی سمجھ میں آ سکتا ہے، اور اسی طرح تمام دوسرے متعلقہ سوالات واضح ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ہر بات کے معانی اور سندات سیکولرازم کی ڈکشنری میں تلاش نہ کی جائیں۔

دور کیوں جائیے سیکولرازم جس نے پہلے مذہب کو نظامِ زندگی سے الگ کر کے رکھا،

---

[1] ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر - از علامہ اقبال - بحوالہ گفتار اقبال ص ۱۲۲

[2] ایضاً ص ۱۲۳

[3] ایضا ص ۱۲۴!

[4] ایضاً ص ۱۲۴

پھر آہستہ آہستہ اُسے دبانا اور کچلنا شروع کیا۔ اور اُس کے ساتھ اخلاقی اقدار و روایات بھی درہم برہم ہونے لگیں، آج اسی کی بنائی ہوئی دنیا کو دیکھ لیجیے کہ اُس نے مجموعی طور پر انسانوں کو کیا دیا ہے۔ کشمکش، ٹکراؤ، تشدّد، جارحیت، خون خرابہ، لوٹ مار، دولت پرستی، کمزوروں سے استحصال عیاشی و فحاشی، کاروباریت، مشینیت، حیوانیت اور بے اطمینانی اور بے مقصدی!

تو اب آپ اس انسانیت سوز عفریت کو دودھ پلانا چاہتے ہیں۔

تحریکِ ریاستِ اسلامی

بہرحال ہم لوگ جنہوں نے جوانی میں اقبال کی فکر سے پرورش پائی۔ اور جنہیں مولانا مودودی سے اسلام کا تحریکی شعور ملا۔ ہمارا حال تو یہ تھا کہ ہم ۱۹۴۰ء سے ہی اپنے دوستوں سے کہتے پھرتے تھے کہ اٹھو اور اسلامی ریاست اور اسلامی تہذیب کا احیاء کریں۔ ہمارے ہاں نظریاتی ریاست (IDIOLOGICAL STATE) کے دن رات چرچے رہتے تھے۔ آپ ذرا کلمہ طیبہ کے مفہوم کے خزانے کھول کر دیکھیے۔ ایک شخص دُنیا کے کسی گوشے میں بیٹھا ہوا کہتا ہے کہ میں ایک خدا کے سوا کسی کے اقتدار، کسی کی قانون سازی کو جائز نہیں مانتا، کسی کی تقسیم حلال و حرام اور کسی کی مقررہ حدود کو میں قبول نہیں کرتا۔ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کو اپنا قائد حیات نہیں مانتا۔ اور اسلام کے سوا کوئی ہیئت اجتماعیہ مجھے قبول نہیں، کوئی دوسرا سیاسی و معاشی نظام مجھے گوارا نہیں ہے، کوئی اور تہذیب میرے ایمان کی کسوٹی پر درست نہیں بیٹھتی — تو ایسے شخص کو کیا حیثیت دی جائے گی۔

میں کہتا ہوں جسٹس منیر صاحب! یہ شخص اپنی ذات میں بالقوۃ اسلامی ریاست ہے اور اسے وجود میں لانے کے لیے اسلام کی اصلاحی تحریک کا علمبردار ہے۔

یہاں ہم دس بارہ سال تک تحریر و تقریر میں اسلامی اسٹیٹ اور اسلامی انقلاب کی باتیں کرتے رہے — ہمیں چھوڑیے، کم سے کم اقبال اور مودودی نے تو حکیمانہ اور مفکرانہ سطح پر اس بحث کو اٹھایا تھا۔ آپ کو واقف ہونا چاہیے تھا۔

مگر ایک جج جس نے مسلمانوں کا پرسنل لا پڑھ لیا ہو اور جس کے ذہن میں یہی تصوّر راسخ ہو کر خدا کے انبیاء نے مل جل کر اس دُنیا کو ایسے لوگ فراہم کیے تھے جو دُنیا کی ریاستوں میں بس ذمّی یا

اقلیتیں بن کر اپنے لیے پرسنل لا کے مطالبے کرتے رہیں، اُسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ اپنی عدالت کی باہر کی چیزوں کو جاننے کی کوشش کرتا۔

کوئی مسلمان جہاں جہاں بھی پورے شعورِ اسلام کے ساتھ موجود ہے، اس کی زندگی اپنی جگہ ایک محدود سی اسلامی ریاست ہے۔ وہ آگے بڑھنے کے لیے ایک جماعت کا ضرورت مند ہے، پھر اور آگے بڑھنے کے لیے اُسے ایک وطن کی بھی ضرورت ہوگی۔ جہاں وہ اور اُس کی جماعت کلمۂ طیبہ کی انقلابی تعلیم کو روبعمل لا سکے۔ اور جب تک ایسا نہیں ہو جاتا، ہر مسلم اپنے ماحول میں مضطرب رہے گا۔ ماحول اُس کی ذہنی اور جسمانی اور تہذیبی زندگی کو دباؤ سے مسخ کرے گا۔ وہ ماحول کے خلاف حتی الامکان تک مزاحمانہ سرگرمیاں جاری رکھے گا۔ حل یہی ہے کہ یا تو وہ اپنے ماحول کو بدلنے پر قادر ہو جائے۔ یا عالمی پیمانے پر کسی بھی بڑی تحریک اسلامی کے جہاد میں شامل ہو جائے۔

آج کے اس مبحث کو لکھتے ہوئے میں نے منیر صاحب کی کتاب کی بہت سی جزوی باتیں الگ چھوڑ دی ہیں۔ اور شاید آگے بھی ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اُن کے ہاں متفرق باتیں اتنی ہیں کہ اُن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اُن کی طرح کی فرصت اور معاشی اطمینان چاہیے۔

بیعت عقبہ میں جو لوگ حضورؐ سے بیعت باندھتے ہوئے اس کا اقرار کر رہے ہیں کہ ہم اپنی جانوں کی ہلاکت اور اموال کی تباہی کے خطروں کے باوجود آپ کا ساتھ دیں گے۔ وہ جانتے تھے کہ معاملہ صوفیانہ یا فلسفیانہ مذہب یا دھرم کا نہیں ہے، یہ تو ایک تحریک جہاد ہے جس میں ہم شریک ہو رہے ہیں۔ اور مکہ میں مظالم بھگتنے والے نومسلموں میں سے کون نہیں جانتا تھا کہ یہ ایک انقلابی حرکت کا آغاز ہے جو سارا نقشہ پلٹ دے گی۔